☆ڈاکٹر خالد علوی

سید ابوالحسن ندوی کے فکری رجحانات

سید ابوالحسن علی ندوی کا عہد فکری و علمی اعتبار سے ہنگامہ پرور عہد ہے۔اس عہد میں تحریکیں پروان چڑھیں، شخصیتیں مشہور ہوئیں اور افکار ونظریات کی کشمکش جاری رہی۔اس عہد کے ہر چھوٹے بڑے شخص نے اپنے فکر و عمل کیلئے راہیں متعین کیں اور ان کے مطابق سرگرم عمل رہا۔بڑی شخصیتیں اس سے مستثنیٰ نہیں۔سید ابوالحسن بھی اپنے عہد کے افکار سے متاثر ہوئے اور انہوں نے بھی اپنے عہد پر اثرات مرتب کئے۔ایک متحرک و فعال انسان کی طرح ان کے بھی فکری رجحانات ہیں اور انہیں انکی تصانیف میں دیکھا جا سکتا ہے۔البتہ یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے رجحانات کے تعین و تجزیہ سے پہلے اس فکری پس منظر کو دیکھ لیا جائے جو اس عہد کے رجحانات کی تشکیل کا باعث بنا۔

فکری پس منظر

برصغیر پاک و ہند کے مسلم معاشرے میں افکار کی کئی لہریں چلتی رہیں اور کسی نہ کسی طرح ہر خاص و عام کو متاثر کرتی رہیں۔ہر زندہ معاشرے کی طرح مسلم معاشرہ بھی اخذ ورد کے تجربے سے دوچار ہوا۔سہولت کیلئے ہم ان فکری لہروں کو عنوان دیتے ہیں اور ان عنوانات کے تحت مختصر تعارف و تجزیہ پیش کرینگے۔غور اور تتبع سے مندرجہ ذیل عنوانات بنتے ہیں۔

☆فرقہ وارانہ فکر
☆اصلاحی فکر
☆تطبیقی فکر
☆احیائی فکر
☆تحریک تجدد

☆سیرت پروفیسر ادارہ علوم اسلامیہ، جامعہ پنجاب، لاہور۔

فرقہ وارانہ فکر

برصغیر میں فرقہ وارانہ فکر کا آغاز مسلم ہندوستان میں ہوا۔ اسے شروع کرنے اور پروان چڑھانے کی ذمہ داری شیعہ علماء اور اشرافیہ کے سر ہے۔ ہمایوں کے عہد سے ایرانی اثرات کے تحت اس کا آغاز ہوا۔ جہاں کہیں انہیں سیاسی قوت میسر آئی انہوں نے جارحانہ انداز میں اپنے افکار و عقائد کے نفاذ کا اہتمام کیا۔ صفوی انقلاب کی قوت موجود تھی اس لئے ان کا رویہ بے لچک تھا۔ چونکہ انہیں شاہی تائید حاصل تھی اس لئے سرکاری سرپرستی میں ان کا دائرہ اثر بڑھتا رہا۔ مسلم ہندوستان، برطانوی ہندوستان اور حال کی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ شیعی فکر کے فروغ میں سرکاری سرپرستی، سیاسی اثر و نفوذ اور معاشی تاثیر کو خاص دخل حاصل ہے۔ کوئی بھی فکری گروہ اپنے اثر و رسوخ کو بڑھانے میں جو وسائل میسر آتے ہیں انہیں کام میں لاتا ہے لہذا اپنے نقطۂ نظر سے انہوں نے درست کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ مسلم معاشرے پر بحیثیت مجموعی اس جارحانہ دعوت کے جو اثرات مرتب ہوئے وہ خوش کن نہیں تھے۔ شیعہ سنی اختلاف علم کلام اور تاریخ کی تعبیر کا اختلاف ہے۔ جس نے خاص فکری مسائل کی بحثیں پیدا کیں۔ برطانوی ہندوستان میں اہل سنت کے ہاں ایک اختلافی لہر اٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے پورے ہندوستان کے دینی حلقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس کی اساس مولانا احمد رضا خان بریلوی کی تحریریں تھیں جو انہوں نے شاہ اسمعیل شہید اور علمائے دیوبند کی بعض تصانیف کے حوالے سے مرتب کیں۔ دیگر مسلمان معاشروں کی طرح ہندوستان کا مسلم معاشرہ بھی مذہب کے توہماتی اور رسوماتی تصور پر عمل پیرا تھا۔ بہت سی رسوم اور کئی اعمال ایسے تھے جو مقامی نوعیت کے تھے یا جنہیں صوفیاء نے عوامی خوش عقیدگی کے تحت گوارا کیا تھا یا رواج دیا تھا۔ اس کی حیثیت عوامی مذہب کی سی تھی اور دیگر مذاہب کی طرح اسلام کا عوامی مذہب بھی موجود تھا۔ مولانا احمد رضا خان بریلوی نے ایک تو مذہب کے اس عوامی اور رسوماتی پہلو کی تائید میں دلائل مہیا کئے اور دوسرے شاہ اسمعیل شہید اور علماء دیوبند کی ان تحریروں کو ہدف تنقید بنایا جن سے انکے بقول تنقیص رسالت یا تحقیر دین ہوتی تھی۔ یہ تنقید اتنی شدید اور اتنی جارحانہ تھی کہ انکی تعبیر کے مطابق یہ لوگ بدمذہب، منحرف اور مرتکب کفر ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل سنت ہمیشہ کیلئے دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے، مسجدیں الگ، مدارس الگ، نمازیں الگ اور دینی تقریبات علیحدہ حتی کہ اہل سنت کے نام کا اشتراک بھی معدوم ہو گیا۔ دیوبندی وہابی کہلائے اور

بریلوی اہل بدعت اوران میں سے ہر ایک اپنے آپ کو اہل سنت کہتا ہے۔اس اختلاف کے نتیجے میں بڑا لٹریچر تیار ہوا۔کلامی بحثیں اور فقہی فتاوی اس اختلاف کا حاصل ہیں اور مناظرے اور مباحثے اسکے عملی مظاہر۔

فرقہ وارانہ فکر ایک طاقتور فکر ہے یہ محض فکری استدلال اور علمی حجت کی بات نہیں بلکہ گہری جذباتی وابستگی کی بات ہے۔یوں کہیے کہ یہ ایمانیات کی بات ہے۔فرقہ وارانہ سوچ رکھنے والے کسی شخص سے،خواہ وہ عالم ہو یا دانشور،سیاسی رہنما ہو یا معاشی کارکن،آپ بات کر کے دیکھیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ اس کے ایمان کی ساری قوت اسی فکر میں سمٹ آئی ہے اور وہ اس فریم ورک سے باہر کسی اور تصور کو درخور اعتنا نہیں سمجھتا۔

اصلاحی فکر

اس فکر کی اساس مسلم معاشرے کے افکار واعمال کی اصلاح ہے۔فکر وعمل کے وہ تمام مظاہر جو کتاب وسنت سے متصادم ہیں یا اس کی روح کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتے ان سے پرہیز کرنا چاہئے۔یوں کہیے کہ یہ عوامی مذہبی طرز عمل کی اصلاح ہے۔صوفیاء کرام نے اصلاحی فکر میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔مقتدر صوفی ہستیوں نے تصوف کی راہ سے آنے والے انحراف اور غیر اسلامی اثرات سے تطہیر کا کام جاری رکھا بدقسمتی سے انحرافی اور انجذابی افکار کی عوامی پذیرائی نے انہیں تصوف کے کھاتے میں ڈال دیا اور ہر منحرف گروہ وحدت ادیان کے نام سے قرآن وسنت سے متصادم افکار و اعمال کو اسلامیت اور روحانیت کا عنوان دیتا ہے۔مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہؒ نے اصلاح معاشرہ اور اصلاح عقائد واعمال کے حوالے سے اہم اقدامات کئے۔یہ دونوں حضرات عالم اور صوفی تھے۔شاہ ولی اللہؒ نے تفہیمات میں عجمی رسوم ورواج کے بارے میں فکر انگیز بحثیں کی ہیں۔اسی فکر کو سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید نے پروان چڑھایا۔اسکے اثرات اب بھی وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔اصلاحی فکر امت مسلمہ کا ورثہ ہے اور ہر دور میں مصلحین اپنے اپنے انداز کے مطابق کام کرتے رہے ہیں۔مسلم ہندوستان میں اس کی بنیاد مجدد الف ثانی نے رکھی اور علماء وصوفیاء کے مختلف حلقے اسے لیکر چلتے رہے۔

تطبیقِ فکر

تطبیقِ فکر سے مُراد وہ سوچ اور رویہ ہے جس کے ذریعہ دو مخالف رجحانات میں مناسبت پیدا کی جاتی ہے۔ مسلم ہندوستان میں اس فکر کے بانی شاہ ولی اللہؒ ہیں۔ شاہ صاحبؒ سے پہلے اختلافات کے دو پہلوؤں نے مسلم معاشرے کی جڑیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔ ایک فقہ و تصوف کا اختلاف تھا جو اہل سنت کے ہاں برپا تھا اور دوسرا شیعہ سنی اختلاف تھا جس نے انتشار و سازش کی ایسی فضا پیدا کر دی تھی کہ مسلم ہندوستان کا سیاسی استحکام خطرے میں تھا۔ ایان میں صوفیوں کے خونی انقلاب کے بعد شیعت میں جارحیت کا عنصر غالب آ گیا تھا اور ہمایوں کے دور اور مابعد میں ایرانی شعراء، فلسفی اور عسکری پیشہ سے متعلق لوگوں کا وارد ہوا۔ شیعہ اشرافیہ کا ایک طاقتور عنصر وجود میں آیا جو عملاً اقتدار کی کشمکش میں شامل ہوا۔ یہ کشمکش فکری و عملی پیچیدگیوں کا باعث بنی۔ شاہ ولی اللہ کے متوازن دل و دماغ نے حالات کی نزاکت کے پیش نظر اعتدال کی راہ اختیار کی۔ علماء ماوراء النہر شیعوں کو کافر گردانتے تھے اور مسلم ہندوستان کے سنی علماء اس کے مطابق فتویٰ دیتے تھے لیکن شاہ صاحب نے اس سے گریز کیا۔ شاہ عبدالعزیزؒ کی روایت کے مطابق شاہ ولی اللہ کو شیعہ گردانا گیا، وہ کہتے ہیں:

"شخصے از والد ماجد مسئلہ تکفیر شیعی پرسید۔ آنحضرت اختلاف حنفیہ کہ دریں باب است
بیان کردند۔ چوں مکرر پرسید، ہماں شنید۔ شنیدم کہ می گفت شیعہ است۔"

شیعوں کا اثر و رسوخ اپنی تعداد سے زیادہ تھا اس لئے فتنہ انگیزی کا ہر وقت خطرہ رہتا تھا۔ عالمگیر کی وفات کے بعد کے حالات سے مسلم تاریخ کا ہر طالب علم واقف ہے۔ شاہ صاحب نے شیعہ سنی اختلافات کو کم کرنے اور مفاہمت کی فضا پیدا کرنے میں جاندار کوششیں کیں۔

اسی طرح شاہ ولی اللہؒ نے فقہ و تصوف میں تطبیق کی کوشش کی۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور مجدد الف ثانی کے درمیان اختلاف علمی طور پر مٹانے کی مساعی کیں۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے درمیان تطبیق کی سعی کی۔ فقہ و تصوف کے اختلاف کے علاوہ خود فقہی اختلافات کی مصیبت بھی موجود تھی۔ شاہ ولی اللہؒ نے فقہی مذاہب کے اختلافات میں بھی اعتدال کی راہ اختیار کی۔ وہ تفہیمات میں اس رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ حنفی و شافعی مذاہب کو احادث کی روشنی میں جائز بلکہ ایک مذہب کی

صورت میں مرتب کر دیا جائے تو پوری امت مسلمہ متحد ہو سکتی ہے۔

بدقسمتی سے اس تطبیقی فکر کو آگے نہیں بڑھایا گیا کیونکہ فرقہ وارانہ رجحانات اتنے قوی ہیں کہ وہ حقیقی اعتدال کی کسی راہ کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں تاہم شاہ صاحب کے اثرات واضح ہیں اور علمی حلقوں میں انکی صدائے بازگشت سنائی دیتی رہتی ہے۔

احیائی فکر

اس فکر کا تعلق اسلام کی نشاۃ جدیدہ سے ہے۔غلبہ دین اس کا ماحصل ہے۔ جمال الدین افغانی اس کے داعی تھے۔ مسلم ہندوستان میں علامہ شبلیؒ، مولانا محمد علی جوہرؒ، علامہ اقبالؒ، ابوالکلام آزاد اور مولانا ظفر علی خانؒ اسکے داعیوں میں سے تھے۔ اسلام کی حقانیت، دور حاضر میں اسکے قابل عمل ہونے، حکومت الہیہ یا اسلامی حکومت کے قیام کی ضرورت، حضور اکرمؐ کے ساتھ سچی محبت اور انکی اطاعت، قرآن کی صداقت اور رہنمائی اور ملت اسلامیہ کی قوت اور اسکا استحکام اس فکر کے اہم اجزاء تھے۔ یہ سب لوگ مغربی تہذیب کے مقابلے میں اسلامی تہذیب کی حیات آفرینی کے حدی خواں تھے۔ سید ابوالاعلی مودودیؒ اس فکر کے نقیب اور انکی تحریک اس فکر کی نمائندہ جماعت ہے۔

متجددانہ یا معذرت خواہانہ فکر

برطانوی استعمار نے مسلم ہندوستان پر غلبہ حاصل کیا تو اسلام کے خلاف مہم شروع کی گئی۔ عیسائی مشنریوں کے ساتھ مقامی ہندوؤں کے جارحیت پسند گروہ بھی اس مہم کا حصہ تھے۔ عیسائی مشنری اور آریہ سماجیوں نے اسلام پر اعتراضات کی مہم کو گرم کر رکھا تھا۔ مسلمان اس کے جواب میں اپنی سی کوششیں کر رہے تھے۔ بہت سی راسخ العقیدہ شخصیات کے ساتھ سید احمد خان، مولوی چراغ علی اور سید امیر علی بھی شامل تھے۔ سید امیر علی نسبتاً معتدل تھے لیکن سید احمد خان اور مولوی چراغ علی نے دفاع اسلام میں بعض ایسے کمزور پہلو اختیار کئے کہ وہ خود متنازع فیہ ہو گئے۔ سرسید مرحوم نے بعض ایسے مسلمات کا انکار کیا جن کے بارے میں مسلمانوں کو شبہات نہیں تھے۔ مثلاً اہل کتاب کے مارے ہوئے جانور کی حلت، جنوں کے وجود سے انکار، معجزات کی مادی تعبیر، حدیث کی حجیت کا انکار، جہاد کی کمزور تاویل وغیرہ۔ یہی معذرت خواہانہ رویہ دراصل متجددانہ فکر کی بنیاد بنا۔ عیسائیوں اور آریہ سماجیوں

نے جن پہلوؤں پر اعتراض کیا تھا انہیں سازگار بنانے کی کوششیں کی گئیں۔ عورت کی حیثیت اور تعداد ازواج کے مسئلے اس میں شامل ہیں۔

سید ابوالحسن کے رجحانات

یہ فکری پس منظر تھا جس میں ہمارے ممدوح نے ہوش سنبھالی، مسلمانوں کے علمی حلقے علی گڑھ اور دیوبند کے زیر اثر تھے۔ دونوں کے نقطہ ہائے نظر میں اختلاف تھا۔ ایک جدید نظام تعلیم کا علمبردار تھا اور دوسرا قدیم طرز تعلیم کا محافظ تھا۔ ندوہ قدیم وجدید، علی گڑھ و دیوبند کو مجتمع کرنے کیلئے وجود میں آیا تھا لیکن اس کا جھکاؤ قدیم کی طرف ہوگیا۔ بلکہ یوں کہیں کہ تصوف و روحانیت کی طرف رجوع ہوگیا۔ سید سلیمان ندوی نے مولانا اشرف علی تھانویؒ سے بیعت کر لی تھی اور علی میاں نے مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ سے۔ مولانا علی میاں نے مولانا احمد علی لاہوری سے دورہ قرآن پڑھا۔ مولانا لاہوری مولانا عبیداللہ سندھی کے مکتب کے آدمی تھے اور انکی فکر میں ولی اللہی تاثیر کے علاوہ جہادی اثرات بھی تھے۔ مولانا علی میاں کے ہاں خاندانی طور پر جہادی اور اصلاحی فکر کا اثر موجود ہے۔ سید احمد بریلوی کی شخصیت کا نام ہی کافی ہے۔ ان کی شخصیت پر تصوف کا گہرا اثر ہے اس لئے فقہی اختلافات کی تنگی کا ان کے ہاں گذر نہیں۔ پھر عربی انشا پردازی کی وجہ سے انہیں عالم عرب سے جو قرب حاصل ہوا وہ فقہی تعصب کے خلاف موثر عامل ہے۔ تاریخ دعوت وعزیمت میں انہوں نے جن شخصیات پر لکھا وہ مختلف فقہی مسالک سے متعلق تھیں اس لئے فقہی تنگ نظری کی گنجائش نہ تھی۔ وہ زندگی بھر فرقہ وارانہ اختلافات سے دور رہے، حالانکہ ان کے قریبی دوست اور جماعت اسلامی میں اکٹھے آنے اور ساتھ نکلنے والے رفیق مولانا منظور نعمانی مناظر تھے۔ بریلوی علماء سے ان کے معرکتہ الآراء مناظرے ہوئے۔ ان کے مزاج میں وسعت اور طبیعت میں رواداری کی ایک وجہ شاہ ولی اللہ کے تطبیقی فکر کی تاثیر ہے۔ شاہ صاحب کی شخصیت ہر ذہین اور صاحب بصیرت شخص کو جذب کرتی ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ مولانا علی میاں اس تطبیقی فکر سے متاثر نہ ہوئے ہوں۔ گویا ان پر اصلاحی اور تطبیقی فکر کے اثرات ایک بدیہی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ذرا توجہ سے دیکھا جائے تو ایسے لگتا ہے کہ ان کی شخصیت پر غالب تاثیر احیائی فکر کی ہے۔ احیاء اسلام ان کا نصب العین لگتا ہے۔ شخصیت کی انفرادی تعمیر وارتقاء بھی احیاء ملت کا وسیلہ ہے۔ مسلمانوں کے ماضی و حال کا تجزیہ اور مستقبل کے احکامات ان کے پسندیدہ

موضوعات ہیں اس اعتبار سے ان کی دو کتابیں احیائی فکر کی نمائندہ قرار دی جاسکتی ہے ایک "دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر" اور دوسری "اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش" ہے اگر چاہیں تو "منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین" کا اضافہ کر سکتے ہیں۔احیائی فکر کے داعیان کے ہاں دو اسلوب پائے جاتے ہیں ایک امت مسلمہ کی عظمت کا اثبات اور دوسرے مغربی تہذیب کا ناقدانہ جائزہ۔امت مسلمہ کی عظمت، انسانی تاریخ میں اس امت کے کارناموں کا تذکرہ، اسلامی تہذیب کا حسن اور انسانی قدروں کی آبیاری میں اس کا حصہ وہ موضوعات ہیں جن کا خوبصورت بیان ان کی کتاب "مسلمانوں کے عروج وزوال" میں ملے گا۔قاری جب مسلمانوں کے کارناموں کا تذکرہ پڑھتا ہے تو اسے ایک روحانی سکون اور علو نصیب ہوتا ہے۔ ذیل کے اقتباس سے آپ اس "Uplift" کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

"ان فاتحین اور حکمرانوں نے دین وعلم وتہذیب کی بخشش میں کبھی بخل وتنگ دلی سے کام نہیں لیا اور حکومت واعزاز کے بارہ میں کبھی وطنیت اور رنگ ونسب کا لحاظ نہیں کیا وہ ایک ابر کرم تھے، جو تمام عالم پر محیط تھا اور اس کا فیض سب کے لئے عام تھا، جو سارے عالم کو سیراب کرتا گیا اور زمین کے ہر حصہ نے اس کو دعائیں دیں اور مخلوقات نے اپنی اپنی استعداد اور قابلیت کے مطابق اس سے نفع اٹھایا۔"(۱)

وہ اس کتاب کے سبب تالیف کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ مسلمانوں کو اس مجرمانہ کوتاہی کا احساس ہو جو انہوں نے انسانیت کے حق میں کی اور اس کی تلافی اور اصلاحی حال کا جذبہ ان کے اندر پیدا ہو، اسی کے ساتھ دنیا کو اپنی اس بدقسمتی کا بھی علم ہو جس سے اس کو مسلمانوں کی قیادت سے محروم ہو جانے کی بنا پر دو چار ہونا پڑا۔اس کو محسوس ہو کہ حالات میں کوئی بڑی تبدیلی اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک کہ دنیا کی قیادت مادہ پرست اور ناخدا ترس انسانوں کے ہاتھ سے نکل کر ان خداشناس اور خدا ترس انسانوں کے ہاتھ میں نہ پہنچ جائے جو پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں اور انہیں کی ہدایات اور تعلیمات سے روشنی اور رہنمائی حاصل کرتے ہیں اور ان کے پاس آخری پیغمبر کی شریعت اور دین و

دنیا کی راہنمائی کا مکمل دستور موجود ہے۔(۲)

ان اقتباسات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ لکھنے والا امت مسلمہ سے دنیاوی قیادت کی توقع رکھتا ہے اور انہیں باور کرا رہا ہے کہ ان کی وجہ سے دنیا کو رحمت وسکون میسر آیا اور انہی کی وجہ سے دنیا کو دوبارہ قرار نصیب ہوسکتا ہے۔ انہیں اپنے قائدانہ فرائض کی ادائیگی کیلئے تیار ہونا چاہئے۔ امت مسلمہ کا کردار ایک منفعل گروہ کا کردار نہیں جو تسبیح ومناجات میں مصروف ہوکر کار دنیا سے لاتعلق ہوجائے۔ یہ تصور احیائی فکر کی روح ہے اور اس کا تذکرہ مولانا ابوالحسنؒ کی دیگر تصانیف میں بھی جلوہ گر ہے۔ وہ صاحب اسلوب مصنف کی طرح ہر موضوع پر اس کی مناسبت سے بات کرتے ہوئے امت مسلمہ کی عظمت کا اشارہ ضرور کرتے ہیں۔ وہ عربوں کو قائدانہ کردار کیلئے آمادہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "آج دنیا ہٹ ہٹا کر پھر اسی نقطہ پر پہنچ گئی ہے جس پر وہ چھٹی صدی مسیحی میں تھی۔ یہ عالم پھر اسی دوراہہ پر نظر آ رہا ہے جس دوراہہ پر رسول اللہؐ کی بعثت کے وقت تھا آج اسکی ضرورت ہے کہ عرب قوم (جس کو رسول اللہؐ سے تعلق خاص ہے) میدان میں نکل آئے اور پھر دنیا کی قسمت بدلنے کیلئے جان کی بازی لگائے اور اپنی تمام آسائش و ثروت دنیا کی نعمتوں، ترقی وخوشحالی کے امکانات اور اپنے سامان راحت کو خطرہ میں ڈال دے۔ تاکہ دنیا اس مصیبت سے نجات پائے، جس میں وہ مبتلا ہے اور زمین کا نقشہ بدل جائے"

پوری کتاب ان آرزوں سے بھری پڑی ہے کہ امت مسلمہ دوبارہ قائدانہ کردار کیلئے تیار ہو۔ کتاب میں دین ودنیا کی تفریق، زاویہ نشینی اور محض ذکر وتبلیغ کی بات نہیں نظر آتی۔ کامل دین اور غالب تہذیب کی تصویر پوری طرح کارفرما دکھائی دیتی ہے۔

مغربی تہذیب کا ناقدانہ جائزہ

مولانا علی میاں کے ہاں مغربی تہذیب کا ناقدانہ جائزہ ایک اہم موضوع کی حیثیت سے موجود ہے۔ یہ تنقیدی جائزہ انکے فکری نظام کا اہم عنصر ہے لیکن اس ناقدانہ تجزیہ میں ان کی حیثیت پیش رو اور امام کی نہیں بلکہ شریک کار اور خوشہ چیں کی ہے۔ بہت سے پہلوؤں پر ان کے خیالات

مستعار ہیں یا مشترک ہیں۔اس میں ان کے پیش رو اقبالؒ اور سید مودودیؒ ہیں۔اقبال کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

"میری پسند اور توجہ کا مرکز وہ اس لئے ہیں کہ وہ بلند نظری، محبت اور ایمان کے شاعر ہیں۔ایک عقیدہ، دعوت اور پیغام رکھتے ہیں اور مغرب کی مادی تہذیب کے سب سے بڑے ناقد اور باغی ہیں۔وہ اسلام کی عظمت رفتہ اور مسلمانوں کے اقبال گذشتہ کے لئے سب سے زیادہ فکر مند، تنگ نظر قومیت و وطنیت کے سب سے بڑے مخالف اور انسانیت و اسلامیت کے عظیم داعی ہیں۔"(۴)

"اقبال ان باغی ناقدین کی صف اول میں تھے، عالم اسلامی نے اس سو سال میں جدید طبقہ میں شاید ان سے بڑا کوئی دیدہ ور نہیں پیدا کیا بلکہ وہ عصر حاضر کے مشرق کے سب سے بڑے مفکر و فلسفی ہیں۔ہم دوسرے تمام مشرقی فضلاء میں مغربی تہذیب پر اقبال کی طرح گہری نگاہ اور ان جیسا جرأت مندانہ تنقیدی نقطہ نظر ڈھونڈھنے سے بھی نہیں پا سکتے۔"(۵)

"اقبال نے فرنگی تہذیب کی بنیادی کمزوریوں، اس کے دبتے ہوئے پہلوؤں اور اس عنصری فساد اور بگاڑ کو دیکھ لیا تھا جو اس کی سرشت اور اس کی طینت میں موجود تھے۔انہوں نے دیکھا کہ مغربی تہذیب سے متاثر ذہن مذہب اور اخلاقی روحانی اقدار کے ساتھ کیا معاملہ کرتا ہے۔انہوں نے فساد قلب و نظر کو اس تہذیب کی روح کی ناپاکی کا ثمر بتایا ہے، جس نے اس سے قلب سلیم کی دولت چھین لی۔(۶)

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب　　کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید　　ضمیر پاک و خیال بلند و ذوق لطیف

اقبال کے وہ مدح خواں اور خوشہ چین ہیں اور نقوش اقبال اس کا ثبوت ہے۔اس کے علاوہ بھی ان تحریروں اور تقریروں میں اقبال کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔اسلام اور مغربیت کی کشمکش میں وہ اقبال کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اقبال ان معدودے چند خوش قسمت افراد میں سے ہیں جو مغربی نظام تعلیم میں غوطہ

لگا کر ابھر آئے ہیں اور نہ صرف یہ کہ صحیح سلامت ساحل پر پہنچے بلکہ اپنے ساتھ بہت سے موتی تہہ سے نکال کر لائے اور ان کی خود اعتمادی، اسلام کی ابدیت اور اس کے وسیع مضمرات پر ان کا یقین اور زیادہ مستحکم ہو گیا۔"(۷)

تاہم وہ اقبال کے دینی فہم کے حوالے سے ایک طرح کا تحفظاتی تاثر ظاہر کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں!

"اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ انہوں نے مغربی تعلیم اور مغربی فلسفہ کا مطلق اثر قبول نہیں کیا اور ان کا دینی فہم کتاب وسنت اور سلف امت کے بالکل مطابق ہے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس آتش نمرود نے ان کے ہزاروں معاصرین کی طرح ان کی خودی اور شخصیت کو جلا کر خاک نہیں کیا اور بڑی حد تک ان کو یہ کہنے کا حق حاصل ہے۔(۸)

طلسم عصر حاضر را شکستم ربودم دانه و ادامش گستم
خدا داند که مانند براهیم بنار او چه بے پرواه نشتم(۹)

مولانا علی میاں سید مودودیؒ کے شریک کار رہے اور ان سے اختلاف بھی کیا لیکن مغربی تہذیب کے ناقد کی حیثیت سے وہ انکے معترف ہیں۔ فرماتے ہیں:

"میرے مولانا کی تحریروں اور جماعت کے لٹریچر سے تاثر اور وابستگی کی بنیاد مولانا کے وہ فاضلانہ تنقیدی مضامین تھے جو انہوں نے مغربی تہذیب اور اسکے فلسفہ حیات اور موجودہ مادی نقطہ نظر کے خلاف لکھے تھے اور جن کا بڑا حصہ ان کے مجموعہ مضامین "تنقیحات" میں شامل ہے۔ یہاں میرے اور مولانا کے خیال میں وہی تو ارد تھا جو ایک چھوٹے اور بڑے نومشق اور کہنہ مشق مصنفوں کے درمیان ہو سکتا ہے"(۱۰)

اگرچہ انکے فکری رجحان کی تشکیل میں اقبال اور سید مودودیؒ سے تاثر کا عنصر موجود ہے لیکن ان کے طبعی میلان اور فطری رویہ کا اثر ان کی تحریروں میں موجود ہے۔ اگر ان کا اپنا میلان اس طرف نہ ہوتا۔ تو یہ تاثر بھی نہ ہوتا۔ مغربی تہذیب پر ان کی تنقید کا خصوصی پہلو مسلمانوں پر اسکے اثرات ہیں۔ پھر اس تنقید میں اس تہذیب کے مفید ثمرات کی تحسین بھی موجود ہے اور اسکے برے اثرات کے عواقب

سے متنبہ کرنا بھی پایا جاتا ہے۔ وہ مسلمانون کے دورویوں کا تذکرہ کر کے ان کا جائزہ لیتے ہیں۔ ایک منفی رویہ کہ مغرب کی ہر شئے کو رد کرنا اور دوسرے مکمل طور پر مغربیت کو اپنا لینا۔ ان کے نزدیک دونوں رویے انتہا پسندی کا مظہر ہیں۔ ترکی کا تجربہ بھی نا قابل قبول ہے اور مغرب کی ہر چیز کو رد کر دینا بھی درست نہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"میرا یقین ہے کہ بیک وقت موجودہ تمدنی سہولتوں، جدید آلات و ایجادات اور سائنسی ترقیات سے استفادہ اور اسلامی تمدن کے حسن و سادگی، حقیقت پسندی، طہارت و نظافت اور اسلام کے اخلاقی اصولوں اور معاشرتی تعلیمات کا کاربند رہنا ممکن اور قابل عمل ہے مگر یہ اس وقت ممکن ہے جب اسلامی حکومتوں اور معاشروں کو آزادانہ و مجتہدانہ فکر و نظر اور جرأت مندانہ منصوبہ بندی کی توفیق ملے۔"(۱۱)

مولانا علی میاںؒ مغربی نظام تعلیم کو اسلامی تہذیب کی تخریب کا سب سے بڑا ذمہ دار سمجھتے ہیں اور اس میں وہ اقبال کی تنقیدات کو بطور خاص پیش کرتے ہیں۔ نقوش اقبال میں وہ "مغربی نظام تعلیم کی تنقید، اور عصری دانشگاہوں کا ظلم عظیم" کے عنوانات سے زوردار گفتگو کرتے ہیں۔ مستشرقین کی تحقیقات کے اثرات اور انکے دیئے ہوئے ایجنڈا کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مذہب کے پرائیویٹ ہونے پر اصرار جس کو سیاست و ریاست میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں، دین اسلام کے ساتھ مسیحی کلیسا کا سا معاملہ، مذہب و سیاست کی تفریق کا نظریہ، مذہب کو ترقی کی راہ میں حائل سمجھنا، سود، شراب، قمار، جنسی تعلقات میں آزادی و بے قیدی کو زیادہ معیوب نہ سمجھ کر نظر انداز کر دینا، قوم پرستی، ماقبل اسلام تہذیبوں اور زبانوں کا احیاء اور لاطینی رسم الخط کی افادیت و اہمیت پر زور"(۱۲) وہ پہلو ہیں جنہیں کوئی مسلمان قبول نہیں کر سکتا۔ "ترکی سے لیکر انڈونیشا تک مسلمان ممالک کے جتنے بھی سربراہ ہیں وہ سب اسی مغربی نظام تعلیم کی پیداوار ہیں۔ اس بنا پر آج عالم اسلام میں دو ذہنوں، دو فلسفوں، دو معیاروں اور دو رخوں کے درمیان کشمکش ہے جو عام طور پر منتج ہوتی ہے زیادہ طاقتور، مسلح، صاحب اختیار و اقتدار گروہ کی کامیابی پر۔"(۱۳)

مولانا ابوالحسن علی احیاء اسلام کے نقیب ہیں۔ وہ اس بارے میں پر امید ہیں اور جدید تعلیم

یافتہ نوجوانوں سے توقعات وابستہ کئے ہوئے ہیں۔امید کی روشنی کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں!

جدید تعلیم یافتہ طبقہ اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود سلامت فہم اور قبول حق کی استعداد و صلاحیت سے محروم نہیں بلکہ عام طور پر وہ قوت فیصلہ،قوت عمل اور حقیقت پسندی میں بعض دوسرے طبقوں سے ممتاز ہے۔بہت سی دینی دعوتوں اور اسلامی تحریکات کو اسی طبقہ سے پرجوش داعی ملے ہیں۔ اس طبقہ سے اسلام کو بعض بڑے صحیح الخیال،عمیق النظر،مفکر اسلام کے شیدائی اور سرفروش مجاہد حاصل ہوئے ہیں۔(۱۴) البتہ وہ مسلمان قیادتوں سے مایوس نظر آتے ہیں۔فرماتے ہیں:

"عالم اسلام کا سب سے بڑا خلا اس قائد اور حوصلہ مند انسان کا فقدان ہے جو مغربی تہذیب کا جرأت و اعتماد اور یقین کے ساتھ سامنا کرے"(۱۵) اور قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت کا حوالہ دیتے ہیں من عمل صالحاً من ذکر أوانثی و هو مؤمن فلنحیینه حیاة طیبةو سنجز ینهم أجرهم بأحسن ما کانوا یعملون(۱۶) اور جو کوئی بھی عمل صالح کریگا۔خواہ مرد ہو یا عورت اور وہ صاحب ایمان ہو تو ہم اسے لازمی طور پر دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائینگے اور انہیں اپنے اعمال خیر کا اجر احسن عطا کرینگے۔

مولانا کے ہاں تنقید مغرب ہو یا عظمت امت مسلمہ،عالم عرب کو دعوت قیادت ہو یا جدید تعلیم یافتہ طبقوں سے اچھی توقعات،سب کا محور احیاء قوت اسلام اور نفاذ غلبہ اسلام ہے۔ان کے بیان میں ادب کی لطافت اور روحانیت کی حلاوت کی تاثیر پائی جاتی ہے اس لئے اس کی اثر اندازی غالباً دوسرے مصنفین سے زیادہ ہے۔جہاں تک مرکزی خیال کا تعلق ہے تو وہ وہی ہے جو اقبال اور مودودیؒ کے ہاں پایا جاتا ہے۔

مولانا علی میاں کے فکری رجحانات کا تذکرہ نامکمل ہوگا اگر ان کے تصور دین کا ذکر نہ ہو۔ احیائی فکر کا منطقی نتیجہ ایک ایسی منظّم جدوجہد ہے جس سے غلبہ اسلام کی راہیں کھل جائیں۔فکری بنیادوں پر ان تمام خطوط کی وضاحت ہے جن پر،دور حاضر میں اسلام کا معاشرہ قائم ہوگا۔نیز وہ فریم ورک بیان کرنا ہوگا جس پر ایک اسلامی فلاحی ریاست کا قیام ممکن ہوگا۔یہ وہ کام ہے جو سید ابوالاعلی

مودودی نے کیا۔ اسلامی نظام کا ایک مکمل خاکہ پیش کیا، اسلامی ریاست کے قیام کے دلائل مہیا کئے ،اس کا دستوری اور انتظامی ڈھانچہ واضح کیا اور دور حاضر میں پیش آمدہ مشکلات کا حل دیا اور مخالفوں کے اعتراضات کا واضح اور مدلل رد پیش کیا۔ ظاہر ہے مولانا علی میاں کو دین کے اس ہمہ گیر تصور سے کیسے اختلاف ہوسکتا تھا چنانچہ اس ہمہ گیر تصور کی بنیاد پر ایک جماعت کی بنیاد رکھی گئی تا کہ اسلامی نظام، اسلامی معاشرہ اور اسلامی حکومت وجود میں آئے۔ مولانا علی میاںؒ اس جماعت میں شامل ہو گئے۔ اسکے اولیں لوگوں میں سے تھے لیکن جلد ہی اس سے نکل گئے اور تبلیغی جماعت سے جا رشتہ جوڑا۔ مولانا کے ہاں اس سلسلے میں ایک تضاد پایا جاتا ہے۔ وہ ایک طرف تو دین وسیاست اور مذہب وریاست کی دوئی کے خلاف نظر آتے ہیں اور اسلام کی مغلوبیت پر پریشان دکھائی دیتے ہیں دوسری طرف غلبہ دین کیلئے کام کے طریق کار میں کسی اجتہاد کو قبول کرنے کو تیار نہیں۔ وہ سید ابوالاعلیٰ مودودی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "دین کی اس جدید تفہیم وتشریح سے نہ مجھے کچھ زیادہ دلچسپی تھی نہ ضرورت جو مولانا کی دوسری کتابوں مثلاً قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں، تفہیمات اور رسائل ومسائل میں پائی جاتی ہے۔ اس لئے کہ اس بارے میں میرا معاملہ کسی ایسے انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان سے بالکل مختلف تھا جو دین کا تصور اور اس کا فہم اسکے اصل سرچشموں (کتاب وسنت اور دینی ماحول کی تربیت) کے بجائے کلیتہً مولانا یا کسی دوسرے مسلمان مفکر و مصنف کی کتابوں سے حاصل کرتا ہے"(۱۷)

میں یہ سمجھتا ہوں کہ سید مودودیؒ نے ان سے کبھی یہ مطالبہ نہیں کیا کہ وہ ان کی ہر رائے سے اتفاق کریں۔ جماعت اسلامی میں شامل ہونے والے علماء برابر کی سطح کے لوگ تھے اور ان میں سے ایک شخص اپنے قائدانہ شعور، تنظیمی صلاحیت اور حالات کی نزاکتوں کے ادراک کے حوالے سے ایسے مقام پر تھا کہ سب لوگوں نے اسے امیر منتخب کیا۔ دین کے ہمہ گیر تصور سے اختلاف ہوتا تو یہ حضرات شامل ہی نہ ہوتے۔ جہاں تک طریق کار کا تعلق ہے وہ ایک اجتہادی مسئلہ تھا جسے دلائل کے ساتھ اجتماعی طور پر طے کرنا تھا۔ یہ سب اہل الرائے تھے اور رائے کے اختلاف پر تو کوئی پابندی نہ تھی البتہ اجتماعی فیصلہ ہونے کے بعد متفقہ لائحہ عمل ہی قابل عمل ہوتا ہے۔ مولانا علی میاںؒ نے طویل عرصہ کے

بعد اپنے اختلاف کو علمی طور پر بیان کیا ہے اور وہ دین کی" تفہیم و تشریح" کے عنوان سے چھپ گئی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے سید ابوالاعلی کی تفسیر دین سے اختلاف کیا ہے۔اُن کے نزدیک حاکمیت الٰہی کی بات الہ کے تصور میں موجود نہیں اور سیاسی جدوجہد کا کار نبوت سے کوئی تعلق نہیں۔ان کے نزدیک" نبی کا کام دنیا کو جنت کی بشارت اور عذاب آخرت کی وعید پہنچانا تھا۔آپ داعی الی اللہ اور سراج منیر بن کر آئے تھے کہ ساری دنیا کو روشن کریں۔آپ مبعوث فرمائے گئے تھے کہ دنیا کو بندوں کی بندگی سے نکال کر صرف خدا کی بندگی میں داخل کریں۔تمام لوگوں کو مادی زندگی کی کال کوٹھڑی سے نکال کر دنیا و آخرت کی وسعتوں میں پہنچا دیں۔(۱۸) وہ قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" سے اختلاف کرتے ہوئے یہ قرار دیتے ہیں کہ کرنے کا اصل کام باطن کی اصلاح اور نفس کی تربیت ہے(۱۹)

علمی طور پر اختلاف کی گنجائش رہتی ہے اور مولانا علی میاںؒ جیسے شخص کا اختلاف کرنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں لیکن اس اختلاف کے پیچھے جو نفسیاتی کیفیت ہے اس کا سمجھنا ضروری ہے۔جب کوئی شخص "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر پڑھے گا تو اس کے سامنے محمدی انقلاب کا نقشہ ابھر کر آئے گا،مسلمانوں کے دور قیادت کی برکات اور مسلمانوں کے زوال کی داستان عبرت واضح ہوگی۔اسے پڑھتے ہوئے قاری کو مصنف کے لفظ لفظ میں اسلام کے حرکی تصور کی جھلکیاں دکھائی دینگی۔سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا صالح حکومت کے بغیر معاشرے کی کلی اصلاح کا امکان ہے؟ کیا سیاسی وعسکری غلبہ" یدخلون فی دین اللّٰہ افواجاً کے امکانات نہیں پیدا کرتا؟ یہ پہلو غور طلب ہیں۔

مولانا علی میاںؒ کے فکری سفر اور عملی زندگی کو دیکھنے کے بعد ہمیں اس فکری تضاد کا سراغ مل جاتا ہے۔اس کے واضح اشارات انکی کتابوں میں بھی موجود ہیں۔اصل مسئلہ یہ ہے کہ انکی تربیت خانقاہی نظام میں ہوئی ہے۔اس مدرس اور خانقاہی نظام کا ماڈل وہ ہے جسے شاہ ولی اللہ نے تفہیمات الٰہیہ میں بیان کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

انبیاء کی دعوت تین چیزوں پر مشتمل ہوتی ہے۔

☆ مبدأ و معاد وغیرہ سے متعلق عقائد کی اصلاح۔اس شعبہ کو علماء نے سنبھالا ہے۔

☆ عبادات و معاملات و معاشرت وغیرہ انسانی اعمال کی صحیح صورتوں کی تعلیم اور حلال و حرام کا

بیان۔اس کی کفالت فقہاء کرام نے اپنے ذمہ لی۔

☆ اخلاص واحسان یعنی ہر کام لوجہ اللہ ہو۔یہ دین وشریعت کے مقاصد ہیں اس کی حیثیت روح کی ہے۔یہ ذمہ داری صوفیاء کرام نے لے لی۔یہ حضرات خود سیراب ہیں اور دوسروں کو سیراب کرتے ہیں۔

اس ماڈل کو دیکھیں تو اس میں غلبہ دین کیلئے جدوجہد کے آثار کہیں نہیں دکھائی دیتے اسکی وجہ یہ ہے کہ یہ ماڈل اس دور کا ہے جب اسلامی تہذیب غالب تھی۔مسلمانوں کو سیاسی وعسکری غلبہ حاصل تھا۔سرحدیں محفوظ تھیں۔اسلامی احکام نافذ تھے۔اقتدار واختیار مسلمانوں کا تھا۔کرنے کا کام صرف یہ تھا کہ مسلمانوں معاشرے کے اندر صلاح وفلاح کے معاملات چلتے رہیں۔لہذا علماء فقہاء اور صوفیاء اپنے اپنے ذوق اور اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق مسلم معاشرے کی خدمت کررہے تھے۔اس ماڈل کو مسلمانوں کے محکوم،مغلوب اور کسی حد تک منحرف معاشرے پر لاگو کرنا کیا کہلائے گا؟اگر جمود اور بے بصیرتی نہ کہا جائے،جو یقیناً سخت بات ہے،تو کم از کم قدامت پسندی تو کہا جاسکتا ہے۔مولانا علی میاںؒ کی تعلیم وتربیت انہیں کسی نئے ماڈل کی طرف آنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔انہوں نے جماعت اسلامی سے نکلنے کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے وہ اسی کی طرف اشارہ کرتا ہے وہ لکھتے ہیں:

"جب میری ہندوستان کے مشہور تبلیغی تحریک کے داعی وبانی مولانا محمد الیاسؒ کی خدمت میں آمدورفت زیادہ ہوئی۔میں جب ان کی زندگی،ان کی باطنی کیفیات اور ان کی ایمان واحتساب کی دعوت سے گہرے طور پر متاثر ہوا اور یہ ذہنی خلیج عمیق اور وسیع ہونے لگی اور مجھے احساس ہوا کہ دعوت نبوت اور اسکے حامل کا مزاج اور اس کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں اور وہ ایک ایسی تحریک ودعوت سے کتنی مختلف ہوتی ہے جس کی بنیاد خالص مطالعہ،ذہانت اور کسی فلسفہ ونظام کے ردعمل پر ہوتی ہے۔میں نے ایک بار لکھنو سے جب مولانا مودودیؒ سے اپنی اس ذہنی کشمکش کا حال لکھا اور انکو مولانا الیاس سے میرے گہرے تاثر اور تبلیغی کام میں روزافزوں انہماک کا حال بطور خود بھی معلوم ہوا تو انہوں نے مجھے اس بارے میں یکسو ہونے کی اجازت بلکہ مشورہ دیا"(۲۰)

تعلیم وتربیت اور خاندانی پس منظر کے باعث وہ تصوف میں زیادہ منہمک ہوئے اور اسی انفرادی تربیت وتزکیہ کا تصور انہیں تبلیغی جماعت میں لے گیا لیکن تبلیغی جماعت میں ان کی حیثیت ایک مربی کی رہی عملاً اس پورے پروگرام میں شرکت کیلئے وہ اپنے آپ کو آمادہ نہ کرسکے۔ وہ میرا موقف اور طریق وفکر کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

"حضرت مولانا محمد الیاس کی ذات سے گہری عقیدت، انکے فہم دین واخلاص پر کامل اعتماد، اس کام کی ضرورت اور افادیت پر یقین اور نہ صرف عملی شرکت بلکہ ایک داعی اور ترجمان کے فرائض انجام دینے کے ساتھ (جو مولانا کیلئے بھی مسرت اور اطمینان کا موجب تھی) واقعہ یہ ہے کہ میرے ذہن کے سانحہ کی (جو ایک علمی ماحول اور مطالعہ سے تیار ہوا تھا) مکمل شکست وریخت عمل میں نہیں آئی تھی اور اس کی جگہ کسی دوسرے ذہنی اور فکری سانچہ نے نہیں لی تھی، یہ صورت حال ان لوگوں کو اکثر پیش آتی ہے جن کا ذہنی اور فکری سانچہ پہلے سے تیار ہو گیا ہو۔۔۔۔۔۔تحریکوں اور دعوتوں کیلئے وہ لوگ زیادہ مفید اور کارآمد ہوتے ہیں جن کا سانچہ انہی تحریکوں میں آنے کے بعد بنتا ہے..........میرا معاملہ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے اس سے مختلف تھا۔ میرا ایک فکری وعملی پس منظر (Back Ground) تھا۔ اصلاحی اور تجدیدی تحریکوں اور انکی مرکزی شخصیتوں کا میں نے نہ صرف مطالعہ کیا تھا۔ بلکہ ان کے تعارف وتذکرہ نویسی کا شرف بھی حاصل ہوا تھا۔ میں ہر دور میں منصوصات وغیر منصوصات اور مقاصد ووسائل میں فرق کرتا رہا اور میرے نزدیک خوب سے خوب تر کی تلاش اور نافع سے انفع کی جستجو کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اسی طرح میرے نزدیک ہر تحریک، ہر دعوت اور ہر ادارہ میں جو دین کی خدمت اور اعلائے حکمۃ اللہ کیلئے قائم ہو نمودار اور ارتقاء زندگی اور اس کے مسائل سے واقفیت اور جائز اور ضروری حد تک ان کی تکمیل اور زندگی سے تطبیق کی کوشش ضروری ہے۔ ورنہ وہ تحریک اور ادارہ نمو اور زندگی کی صلاحیت سے محروم اور جمود کا شکار ہو جائے گا اور اس کی افادیت محدود سے محدود تر ہو جائے گی..........

میں مولانا کی حیات میں بھی کبھی کبھی تنہائی میں اقبال کا یہ شعر پڑھتا تھا:

اسی کشمکش میں گذریں میری زندگی کی راتیں　　　کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی

لیکن مولانا کی قوت نسبت اور بے پایاں شفقت اور عملی مشغولیت نے ان کی حیات کے پورے عرصے میں اس فکر کو دبا رکھا تھا۔ مولانا کی وفات کے بعد وہ نمایاں طور پر ابھرنے لگی اس نے یہ شکل اختیار کی .... اور ذہین و علمی طبقہ کے لئے اطمینان بخش اور پُرکشش بنانے کیلئے اصول دعوت اور اسکے اجزاء کو قائم رکھتے ہوئے .... کم تبدیلیوں اور زیادہ اضافوں کی ضرورت ہے۔ مختلف مجالس میں مولانا محمد یوسف صاحب اور ان کی اہل شوری سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی مگر اندازہ ہوا کہ ان کا ذہن اس کا ساتھ نہیں دیتا............

البتہ اپنے ذہن کے کام کرتے رہنے کو روکنا قدرت میں نہیں تھا اس لئے یہ فیصلہ کیا کہ مرکز سے اس تعلق اور دعوت کی مشغولیت کو جاری رکھا جائیگا، البتہ اپنے دائرہ کار (لکھنو اور اسکے اطراف) میں اس کو زیادہ مفید بنانے اور حالات و ماحول کا لحاظ رکھنے اور دعوت و تفہیم کی اپنی زبان استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ قل کل یعمل علی شاکلتہ فربکم اعلم بمن ھو اھدی سبیلاً ایک دائمی اور عالمگیر حقیقت ہے۔"(۲۱)

علمی اعتبار سے مستحکم اور روحانی لحاظ سے لطیف ترین مرتبہ کے انسان تھے اس لئے وہ مسلسل ترقی پذیر رہے۔ البتہ انکے فکری رجحانات غلبہ حق، احیاء اسلام کے ساتھ فکر آخرت تزکیہ باطن اور استحکام ذات کیلئے تصوف و احسان ضروری عناصر بھی شامل رہے۔ یہ حقیقت ہے۔ کہ تحریکی فکر ان پر غالب رہا۔ جماعت اسلامی سے نکلنے اور مولانا مودودی سے اختلاف کے باوجود ان کی تقریریں اور تحریریں حرکی فکر کی نقیب رہیں۔

حواشی

۱۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، ۱۳۷

۲۔ ایضاً،۱۴

۳۔ ایضاً، ۱۷۳،

۴۔ نقوش اقبال،۳۲

۵۔ ایضاً، ۱۷

۶۔ ایضاً، ضرب کلیم،۶۹

۷۔ اسلام اور مغربیت کی کشمکس ،۲۴۸

۸۔ ایضاً

۹۔ ارمغان حجاز، ۶

۱۰۔ پرانے چراغ،۲/۳۱۳

۱۱۔ اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش/۲۹۰

۱۲۔ تفصیل کیلئے دیکھئے نقوش اقبال،۵۷

۱۳۔ اسلامیت ومغربیت کی کشمکش/ ۲۵۱

۱۴۔ ایضاً ۲۵۲

۱۵۔ ایضاً ۲۷۵

۱۶۔ ایضاً، ۲۹۷

۱۷۔ ایضاً

۱۸۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر/۹۱

۱۹۔ عصر حاضر میں دین کی فہیم وتشریح/۱۵۴

۲۰۔ پرانے چراغ،۲/۳۱۴

۲۱۔ کاروانِ زندگی۱/۳۱۴۔۱۶